© rasailojaraid.com

قرار پائے گا، لیکن مطلقاً اور ہر حالت میں عورت کے حق نکاح کو سرپرست کی رضامندی پر منحصر اور موقوف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (الشیبانی، الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ، ۳/ ۵۱۲۔ الطحاوی، شرح معانی الآثار، ۲/ ۳۷۰)

مزید برآں اس معاملے میں اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر بحث ارشادات بنیادی طور پر ایک قبائلی معاشرت کے پس منظر میں فرمائے گئے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ خاندان اور سماج کی شیرازہ بندی قبائلی معاشرے میں مختلف اصولوں پر ہوتی ہے اور متمدن اور ترقی یافتہ معاشروں میں دوسرے اصولوں پر۔ ایک قبائلی معاشرہ اپنی ساخت کے لحاظ سے رشتے ناتوں کو جس طرح interdepedent بناتا ہے، اس میں فرد کے حقوق اور اختیارات بہرحال زیادہ محدود اور خاندان اور سماج کی پسند ناپسند کے زیادہ زیر اثر ہوتے ہیں۔ سماجی تنظیم کے اصولوں کے تحت اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قبائلی معاشرے میں خاندان، قبیلہ اور سماج فرد کو ایک غیر قبائلی معاشرے کے مقابلے میں زیادہ تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اس بنا پر اس کا بھی بجا طور پر استحقاق رکھتے ہیں کہ فرد اپنے فیصلوں میں ان کی پسند اور ناپسند کو خاص طور پر ملحوظ رکھے۔ معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ جوں جوں قبائلی نظم کمزور ہوتا جاتا ہے، فرد اور سماج میں اس کو تحفظ دینے والے گروہوں یعنی خاندان اور قبیلوں پر اس کا انحصار بھی کم ہوتا جاتا ہے اور نتیجتاً اسے اپنے فیصلوں کو اپنی صواب دید کی روشنی میں کرنے کی زیادہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بحث کی روشنی میں دیکھیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ حکم کی تعبیر اس مخصوص سماجی صورت حال کے تناظر میں بھی کی جاسکتی ہے جس کے پیش نظر آپ نے یہ فیصلہ فرمایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حکم کا مقصد دراصل عورت اور اس کے سرپرست کے باہمی حقوق واختیارات کی حتمی وقطعی تعیین نہیں، بلکہ مخصوص زمان ومکان میں سماج کے ایک اہم ادارے یعنی خاندان کو انتشار اور انہدام سے بچانا ہے۔

سرسید احمد خان اور مذہبی علماء

سرسید احمد خان اور ان کے مذہبی وسیاسی افکار گزشتہ دنوں سوشل میڈیا میں زیر بحث رہے۔ سرسید کے ناقدین نے ان کی مذہبی تعبیرات اور برطانوی اقتدار سے متعلق ان کے جذبات وفاداری کو موضوع بنایا، جبکہ حامیوں نے اس کے جواب میں ''ملائیت'' کو بے نقط سنائیں۔

اس تناظر میں یہ مختصر وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کی مذہبی تعبیرات کو اگرچہ راسخ العقیدہ علماء نے علمی سطح پر رد کیا (بلکہ سچ یہ ہے کہ انھیں سرسید کے علاوہ کسی نے قبول ہی نہیں کیا)، لیکن انھیں ''ہوا'' نہیں بنایا اور نہ ان کی بنا پر ان کے خلاف مذہبی فتوے بازی کی کوئی مہم ذمہ دار علماء کی طرف سے منظم کی گئی، بلکہ اکابر علماء نے سرسید کی اس کوشش کو ان کے خلوص کی بنا پر ہمدردانہ نظر سے دیکھا اور ان پر کوئی فتویٰ عائد کرنے سے گریز کیا۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے سامنے کسی نے سرسید کے مذہبی خیالات پر سخت الفاظ میں تبصرہ کیا تو مولانا نے کہا کہ ''ان کی ظاہری تقریر کو نہ دیکھو، ان کے قلب کو دیکھو کہ کیسا ہے''۔ اسی طرح ایک موقع پر انھوں نے چند مولوی صاحبان کو مسجد میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ سرسید روایات صحیحہ کا انکار کرتا ہے، تواتر کا انکار کرتا ہے، کافر ہے وغیرہ وغیرہ تو اپنے حجرے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکلے، مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا ''یہ لوگ اس بے چارے کو کافر بناتے ہیں، مگر اس کے قلب کو دیکھ کہ کیسا ہے۔''
(''کمالات رحمانی''از شاہ تجمل حسین بہاری، بحوالہ صدق جدید، ۵ مئی ۱۹۶۱ء)

اسی طرح کے خیالات مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تھے، چنانچہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب، مولانا کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''سرسید کا عقیدہ توحید اور رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا، بلا وسوسہ اور نہایت پختہ تھا جیسا کہ ان کی بعض تصانیف سے مجھ کو ظاہر ہوا اور قرآن وحدیث کی جو توجیہات انھوں نے کیں، ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ گو اس کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ غلط تھا، اس لیے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں۔'' (اشرف السوانح از خواجہ عزیز الحسن مجذوب، جلد اول، ص ۲۱۵)

اس کے علاوہ سرسید کے متعارف کردہ بہت سے نئے مذہبی مباحث سے علماء نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس پہلو پر اب بعض مطالعات بھی سامنے آ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر بھارت کے ممتاز محقق مولانا رضی الاسلام ندوی نے ''سرسید کی تفسیر القرآن اور مابعد تفاسیر پر اس کے اثرات'' کے زیر عنوان اپنے مقالے میں سرسید کی تفسیر قرآن کی تالیف کا فکری پس منظر واضح کیا ہے اور سرسید کے منہج تفسیر پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن اور بائبل کے بیانات کے تقابلی مطالعہ، اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کے رد اور غیبیات ومعجزات کی عقلی توجیہ کو اس کی اہم خصوصیات میں شمار کیا ہے۔ مصنف نے یہ دلچسپ حقیقت بیان کی ہے کہ تفسیر قرآن کے ضمن میں ان تینوں پہلوؤں سے بعد کے مفسرین نے سرسید کے اثرات قبول کیے اور اردو تفاسیر میں نہ صرف قرآن اور بائبل کے تقابلی مطالعہ اور اسلام پر اعتراضات کا رد کرنے کی ریت قائم ہوئی، بلکہ غیبیات اور معجزات کی عقلی توجیہ کے باب میں بھی ''اس تفسیر کے مابعد تفاسیر پر اثرات مرتب ہوئے اور اہل علم نے اس کے اسلوب اور انداز تحقیق کو اپنایا۔'' (ص ۲۳)

مصنف کے خیال میں اس طرز فکر کے بعض مثبت اثرات بھی ہیں، چنانچہ ''قدیم مفسرین کی عجوبہ پسندی کا یہ حال تھا کہ وہ ایسے واقعات کو بھی جن کی مناسب عقلی توجیہ ممکن ہے، معجزات قرار دیتے تھے۔..... معجزات کے سلسلے میں سرسید کا نقطہ نظر تو قبولیت حاصل نہ کر سکا، لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عجوبہ پسندی کی شدت میں کمی آئی اور بعض قرآنی واقعات پر اس حیثیت سے بھی غور ہونے لگا کہ ان کی عقلی توجیہ کر کے انھیں غیر معجزانہ واقعات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اسے بھی تفسیر سرسید کا ایک قابل لحاظ اثر قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (ص ۲۴) اس نکتے کی وضاحت میں مصنف نے متعدد مثالیں بھی نقل کی ہیں۔ سرسید کی تفسیری خدمات کے حوالے سے مصنف کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ بعض پہلوؤں سے ''یہ تفسیر سرسید کی مذہبی خدمات میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور یہ ان کا ایک قابل قدر علمی کارنامہ ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ جہاں ان کی غلطیوں اور لغزشوں پر بے لاگ تنقید کی جائے، وہیں ان کی وقیع تحقیقات کو سراہا جائے۔'' (ص ۱۱)

جہاں تک برطانوی اقتدار کے حوالے سے سرسید کی فکر کا تعلق ہے تو اس میں اور مذہبی علماء کی ایک بڑی تعداد کے زاویہ نظر میں بنیادی اشتراک دکھائی دیتا ہے، تاہم یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر ان شاء اللہ ہم آئندہ کسی نشست میں بات کریں گے۔

© rasailojaraid.com